حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۷

طُوفانِ عظیم

قلبِ عاشق جب ہر قسم کی خواہشات اور خیالات سے پاک ہو جاتا ہے تو آئینہ بن جاتا ہے جس کو ایک مبتدی بھی محسوس کرنے لگتا ہے اور مستقبل کی عکاسی کرنے لگتا ہے۔ اس قسم کی خبر خوابوں اور بشارتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ ہر بات بالمشافہ ہوتی ہے۔ مگر دل کی صفائی کے باوجود جب تک یقین کی قوت اس میں نہ ہو اور اندر غوطہ لگانے کا راستہ معلوم نہ ہو اس وقت تک ایسی باتیں دھندلی دھندلی معلوم ہوتی ہیں۔ دل کا آئینہ جب پوری طرح مجلا ہو جاتا ہے تو ساری کائنات کے زیر و بم کا ترجمان بن کر اس کی عکاسی کرنے لگتا ہے۔ دل کا آئینہ چونکہ اپنا ہی ہوتا ہے اس لئے جہاں وہ فروغ زندگی کے بے پایاں ابھار کی ایک لطیف لذت اور بے لوث خوشی محسوس کرتا ہے وہاں ساری دنیا کے دُکھ درد کو بھی اپنے میں سمو لیتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ یہ آئینہ قدرت کے اس ارادہ اور مشیت کی بھی عکاسی کرتا ہے جس نے لفظ ''کُن'' کی شکل اختیار کر کے عالم کو وجود کی شکل دی تھی۔ یہی آئینہ جب مکمل ہو جاتا ہے اور بیچ میں کوئی پردہ باقی نہیں رہتا تو پھر ایک ہو جاتا ہے اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو پھر عالم اسی کے سارے حالات کا آئینہ بن جاتا ہے۔ عاشقی و معشوقی کے عجیب رموز و اسرار ہیں۔ جب دوئی مِٹ جاتی ہے تو عاشق و معشوق کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ اس شانِ یکتائی میں سارا عالم اس فرد کی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے اور اس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ کُن کی خاصیت رکھتا ہے۔

گفتہٗ اور گفتہٗ اللہ بود　　گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

ترجمہ: (اس کا کہنا خدا کا کہنا ہوتا ہے حالانکہ وہ قول خدا کے بندے کے حلق سے نکلا ہوتا ہے)

عالمِ اسباب میں تو ایک چیز دوسری چیز سے بنتی ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے۔ مگر اس مقام پر ہر چیز اور ہر واقعہ عدم سے خود وجود میں آجاتا ہے اور نفی سے اثبات خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی وجہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی سامان کی۔

باطن سے اُٹھنے والے طوفان کی کون عکاسی کرتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ بڑی بڑی جنگیں، زلزلے، طغیانیاں اور اسی طرح کے واقعات کسی نہ کسی فرد کے باطن کے عکس ہوں۔ ایسے فرد کے جو مرکز حق ہو چکا ہے اور کیا عجب ہے کہ ملتوں اور قوموں کا فروغ اور نشوونما بھی کسی مرد حق آگاہ کے قلب کی کیفیات کے عکس ہوں۔ ہر برگزیدہ ہستی کی زندگی میں ایک یا دو ایسے نازک وقت ضرور آتے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اس کی زندگی ایک پلٹا کھاتی ہے اور اس کی حیات کا ایک نیا باب شروع ہو جاتا ہے۔

جس طرح بطنِ مادر میں نو مہینے پرورش پا کر جب بچہ اس روشنی کی دنیا میں قدم رکھتا ہے دو تو خون سے پرورش کرنے والی ماں کو ایک قیامت خیز طوفانی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب کسی برگزیدہ ہستی کی منزل ختم ہو جاتی ہے تو ماحول جس نے اپنے گہوارے میں جھلا جھلا کر اسے پالا اور اپنی رنگینیوں کے گیت گا گا کر پوسا تھا۔ اس کی جدائی سے تڑپ اُٹھتا ہے اور اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔

کتنا مشکل اور اہم سوال ہے کہ منزل کا مسافر اپنے ارادے اور مرضی سے قدم اُٹھاتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ مشیت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں پھینکا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام کو محترم زلیخا کی تہمت پر جب جیل خانے بھیجا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب دار کی سزا دی گئی، اور حضرت شمس تبریزؒ کی جب کھال کھینچی گئی تو اس کی تہہ میں کون تھا اور یہ کس کی کارفائی تھی۔ یہ سب بڑے نازک معاملات ہیں۔

جن ہستیوں سے رب العزت کو کچھ کام لینا ہوتا ہے ان کو ایسے حالات کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے اور اسی منزل کے طے کرنے کے بعد بھی جسم کا خول ان کے بسیرے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے یعنی مَوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (موت سے پہلے مر جائو) کے بعد حیات جاودانی عطا ہوتی ہے اور وہ فانی جسم میں رہتے ہوئے اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان میں وہ جن کو عالمِ مثال میں کچھ کرنا نہیں ہوتا پس پردہ مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ منزل ایسی ہوتی ہے جس کے راستہ کو طے کرنے کے لئے روح انسانی کو لازمی طور پر اس جسم کے بندھن سے سبکدوش ہونا پڑتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صدیوں میں ایک ایسی ہستی بھی عالم وجود میں آتی ہے جو زمان و مکان سے آزاد ہو چکنے پر بھی اس مٹی کے جسم میں رہنا پسند کرتی ہے۔ یہ مقامِ عبودیت ہے اور تکمیل انسانی کا آخری مقام۔ یہ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ اور خالق کائنات کا انسانیت پر آخری اکرام ہے۔ یہ وہ احسان ہے جس کی ابتدا الست بربکم سے ہوئی اور انتہا میں اس نے عرشِ اعظم پر قاب قوسین کی شکل اختیار کی۔ سرور کائناتؐ کا ارشاد ہے کہ میری اُمت کے افراد بنی اسرائیل کے نبیوں کے برابر ہوں گے اور ان

پر فوقیت بھی رکھیں گے۔ یہ بنا بنایا لقمہ یہ پکی پکائی روٹی اس ننھی اُمی عربی کی رحمتوں کا باطنی صدقہ ہے جس کا فیضان سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔

سنہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے بارش کا موسم تھا۔ کئی دن سے فضا میں سکوت اور ایسی ہیبت طاری تھی کہ مچھیرے اور گائوں کے بڑے بوڑھے بھی یہ کہہ رہے تھے کہ کوئی زبردست طوفان آنے والا ہے۔ ایک دن نو عمر بابا صاحب گھٹنوں میں سر دبائے خدا جانے کس عالم میں غرق بیٹھے تھے کہ بے ساختہ رحمن خاں کو آواز دی جیسے بہت ہی عجلت ہو اور ان سے کہا کہ تم لوگ فوراً گھر چلے جائو۔ ایک زبردست طوفان آنے والا ہے۔ یہ جو کالا کمبل پڑا ہے اسے خوب اچھی طرح میرے گرد لپیٹ کر پیروں کے نیچے دبا دو۔ رحمن خاں اور دوسرے خادموں نے بہت اصرار کیا کہ آپ کو چھوڑ کر ہم کیسے جائیں۔ آپ کا کیا حال ہو گا۔ مگر بابا صاحب نے سخت حاکمانہ لہجے میں ان سے فرمایا کہ جیسا کہا گیا ہے ویسا کرو اور زیادہ باتیں نہ کرو۔ حکم تھا، کس کی مجال تھی کہ اس میں دخل دیتا۔ بابا صاحب کو کمبل لپیٹ کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے رات کیا تھی قیامت تھی۔ ایسا طوفان۔ اس گرد و نواح کے لوگ کہتے ہیں کہ کبھی نہ آیا تھا۔ ایسی موسلا دھار بارش تھی، جیسے آسمان کے کواڑ کھل گئے ہوں۔ ایسی تیز ہوا تھی کہ آس پاس کی پہاڑیاں بھی ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اُکھڑ کر گھسٹتے ہوئے اپنے ساتھ اونچے مکانوں کو تباہ کرنے لگے تھے۔ کچے مکانوں کا تو کیا ذکر، وہ تو جیسے تھے ہی نہیں اور گھپریل کے مکانوں کی چھتیں اُڑ اُڑ کر کہیں سے کہیں جا پہنچیں۔ راجہ کا قلعہ اور اس کے سنگین محلات لرزنے لگے اور ان کے کواڑ اپنے کُندے توڑ توڑ کر کہیں سے کہیں جا گرے۔ جو عالم باہر تھا وہی مکانوں کے اندر۔ پانی ہر گوشہ میں اپنا جوش دکھا رہا تھا، کہیں جائے پناہ نہ تھی۔ آدمی دو تو دیواروں کی آڑ میں کہیں نہ کہیں اپنی حفاظت کر رہے تھے مگر بے چارے مویشی تھے کہ طوفان کے ساتھ بہے چلے جا رہے تھے۔ اور نہ جانے کہاں کہاں ٹکریں کھا کھا کر ختم ہو رہے تھے۔ پرند اس طرح درختوں اور دیواروں سے ٹکریں کھا کر زمین پر گر رہے تھے جیسے کسی کی آنکھوں سے آنسوئوں کے قطرے۔ وہ رات کیا تھی، گویا قیامت تھی۔ بوڑھوں نے خدا کی پناہ مانگی اور اس کو یاد کیا اور جوان اپنی اپنی کارسازیوں اور تدبیروں میں مشغول رہے۔ جنگل میں چٹانوں پر تن تنہا چھوٹی سی پھونس کی جھونپڑی میں اللہ کا ایک بندہ سر بہ زانو کالی کمبلی میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ اس پر جو گزری اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

مخلوق پریشان تھی۔ مائیں بچوں کو سینہ سے لگائے جہاں دیوار کا سہارا مل گیا دھڑکتے دلوں اللہ اللہ کرنے بیٹھ گئیں۔ بچے سراسیمہ، جوان بدحال اور بوڑھے اللہ اللہ اور رام رام کا وِرد کر رہے تھے۔ نفسی نفسی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ اس فقیر کی جو جنگل میں تھا کون فکر کرتا۔ عیش و آرام کے دن چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں مگر مصیبت کا ایک ایک لمحہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ساکن ہو گیا اور یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ اس شدت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر یہ وقت گزرا ہو اور وہ بھی اسی وقت تک جب تک

کہ وہ واقعہ گزرتا ہے۔ بعد میں آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ صرف ایک دھندلا سا خیال ہی باقی رہ جاتا ہے۔ دنیا والے وقت کو گھڑیال، آفتاب کے طلوع و غروب اور موسموں کے آنے جانے سے ناپتے ہیں مگر عاشق وقت کو دل کی دھڑکنوں سے، قلب کے اضطراب اور اپنی متحیر آنکھوں کے سکوت سے ناپتا ہے۔

محشر بدامن رات جوں توں کٹ ہی گئی۔ صبح ہوئی تو نہ وہ شور تھا نہ وہ طوفان۔ سورج مسکراتا ہوا اپنی کرنوں کا سونا تقسیم کر رہا تھا اور اس کی پیشانی پر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پسینہ کے ننھے ننھے قطرات جمے ہیں اور وہ کسی سخت محنت کے بعد تھک سا گیا ہے۔ زمین کا بُرا حال تھا۔ جنگل کے درخت اور ان درختوں پر کچھ سانپ لپٹے ہوئے کچھ مردہ کچھ زندہ اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔ ہر قسم کے جانوروں کی لاشیں جھاڑیوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ آپس میں اس طرح خلط ملط تھے کہ جیسے کسی مصور نے تختی پر کوئی حسین منظر بنانے کے بعد ہاتھ پھیر دیا ہو۔ دریائوں پر جو بڑے بڑے پختہ پُل بنے ہوئے تھے، ان کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

رحمن خاں صاحب اور ان کے ساتھیوں ک فکر ہوئی کہ نہ جانے بابا صاحب زندہ ہیں یا مر گئے۔ وہ بیوی بچوں کے لئے کچھ انتظام کر کے چند ساتھیوں کو لے کر بابا صاحب کی جھونپڑی کی طرف بھاگے۔ بابا صاحب تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ نہ کوئی سڑک اور نہ ہی کوئی پگ ڈنڈی۔ اور جو راستہ تھا وہ بھی جنگل کے جھاڑ جھنڈ سے پٹا پڑا تھا۔ مگر ایک جذبہ تھا جو اُن لوگوں کو لئے جا رہا تھا اور منزل پر وہی پہنچتے ہیں جن کا جذبہ صادق ہوتا ہے۔ آخر یہ لوگ وہاں پہنچ ہی گئے۔ دیکھا تو چٹان تو نظر آ رہی تھی۔ مگر جھونپڑی کا پتہ نہیں۔ البتہ چٹان پر کوئی کالی کالی سی گٹھری ضرور نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کے دل دھڑکنے لگے کہ کہیں بابا صاحب ختم تو نہیں ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ جس طرح سے انہیں چھوڑ کر گئے تھے ویسے ہی اس کمبل میں لپٹے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ بھی سمجھدار تھے۔ اس ڈر کے مارے کہ اللہ جانے زندہ ہیں تو کس حال میں ہیں اور کس عالم میں ہیں۔ ان لوگوں کی ہمت نہ ہوئی کہ قریب جا کر انہیں ہلا کر دیکھیں۔ آس پاس جو بھی سوکھی لکڑیاں ملیں ان کو جمع کر کے انہوں نے بابا صاحب کے آگے آگ جلادی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اچھی خاصی آگ روشن ہو گئی تو اس میں اور بہت سی بڑی بڑی لکڑیاں ڈال دیں۔ اب قدِ آدم شعلے بھڑکنے لگے۔ مگر اس کمبل کی گٹھڑی میں نہ کوئی حرکت پیدا ہوئی نہ کوئی جنبش۔ ان لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔

محبت کا رشتہ تھا، اور خدمت کا لگائو۔ دل یہ کیسے تسلیم کرے کہ ''ختم فسانہ ہو گیا۔'' یہ لوگ اور قریب پہنچے اور پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر شور مچانے لگے۔ پھر اس وارفتگی کے بعد شدید غم، یاس اور حسرت کے ساتھ یہ لوگ خاموش ہو گئے اور گٹھڑی کی طرف تکنے لگے کہ اس میں کوئی حرکت تو نہیں ہوئی۔ چند منٹ کے بعد گٹھڑی میں سے ایک گہری آواز نکلی ''باباہ''۔ وہ بابا کی آواز تھی یا ایک آہ تھی۔ ان لوگوں کے دل باغ باغ ہو گئے۔ زبان سے نکلا خدا کا شکر ہے بابا صاحب زندہ ہیں۔ اب یہ لوگ قریب ہو گئے

اور کمبلی کھولی جو برف کی طرح ٹھنڈی تھی اس میں باباصاحب سر بہ زانو ہاتھ گھٹنوں سے لپیٹے ہوئے اسی طرح بیٹھے تھے جس طرح یہ لوگ چھوڑ کر گئے تھے۔ سارا جسم لکڑی کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے اُٹھانے کی کوشش کی مگر گردن سخت ہو گئی تھی۔ البتہ پیشانی گرم تھی اور اس پر پسینہ کے قطرے تھے۔ جلدی جلدی ایک شخص گھر گیا اور چائے کا سامان لایا۔ اس وقفہ میں جتنے بھی لوگ وہاں آ گئے تھے اپنے ہاتھ سینک سینک کر باباصاحب کو گرمی پہنچانے لگے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد باباصاحب کے جسم میں گرمی آ گئی اور آپ کا عضو عضو کھلنے لگا۔ بالآخر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں آپ کا بدن اس قابل ہو گیا کہ لوگوں نے آپ کو اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ آپ نے ہاتھ پائوں کو حرکت دی اور چائے نوش فرمائی۔ اس وقت باباصاحب کے چہرے پر بالکل اسی طرح مسکراہٹ تھی جیسی صبح کے سورج کے چہرے پر تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی اسی طرح تھے جیسے تھکے ہوئے ہوں۔

باطن کے بھید کون پائے اور اس سمندر کی گہرائی کا اندازہ کون لگائے۔ طوفانی رات میں دنیا پر جو گزری وہ تو سب نے دیکھا اور جو باباصاحب کے خاکی جسم پر گزری وہ بھی کچھ ایسی ہی ہو گی جیسے اوروں پر بیتی، مگر اندر کیا ہو رہا تھا اور مشیت کا وہ کون سا ارادہ تھا جو ایک کوہِ آتش فشاں کی طرح شعلہ زن تھا بظاہر دیکھنے کو دنیا وہی تھی اور باباصاحب بھی وہی تھے مگر ہو کیا گیا تھا۔ اسے کون بتائے اور کیسے بتائے۔ جب فنا کی منزلیں پہلے ہی سے طے ہو گئی ہوں تو پھر یہ فنا در فنا کیا بات تھی، اور فنا ہوتی کون چیزوں کو ہے۔ رازِ حیات کیا ہے۔ کیا موت قبل ان تمو تو بھی کوئی منزل ہے اور جسمانی زندگی میں کیا اس کا بھی کوئی نازک مقام ہے۔ جو خوش نصیب انسانوں کو اس قسم کی فنا سے میسر آتا ہے۔ سب کچھ سہی مگر

ع فنا کیسی بقا کیسی جب اُس کے آشنا ٹھیرے

سنہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے، ایک دن ایک خادم نے باباصاحب سے پوچھا کہ مریدی کیا چیز ہے تو باباصاحب نے فرمایا ”تم نے کبھی قلمی آموں کے پیڑوں کی پرورش ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ ایک آم کی ایک گٹھلی لی جاتی ہے چاہے وہ کسی قسم کے آم کی ہو آم کہلاتی ہے۔ اس کو ایک گملے میں دبا دیا جاتا ہے۔ جب پودا سال دو سال میں ہاتھ بھر کا ہو جاتا ہے تو کسی قلمی درخت میں چاہے وہ درخت سورن ریکا کا ہو یا امام پسند کا ہو لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے پودے کے نازک سے جسم میں چاقو سے شگاف کیا جاتا ہے۔ اس کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور آنسو بھی نکلتے ہیں ایسا ہی شگاف اس درخت کی شاخ میں بھی کیا جاتا ہے اور ان دونوں کے شگاف زدہ حصوں کو آپس میں ملا کر کپڑے کی دھجی سے باندھ دیا جاتا ہے اور تھوڑی سی مٹی لگا کر پھر اس کو روزانہ پانی سے تر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس درخت کے سایہ میں عرصہ تک وہ پودا رہتا ہے اور جب قلم بند شاخ میں دو نئے پتے نکل آتے ہیں تو پھر درخت سے جو پیوست تھا اس کو قلم کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت گملے والے پیڑ کو تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی مگر اس قلمی درخت کو تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جیسے

اس کی کوئی انگلی کٹ گئی ہو۔ پھر گملے کو نیچے اُتار کر اس درخت کے سایہ میں کہیں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس گملے میں اب دو شاخیں ہوتی ہیں۔ ایک اپنے تخم کی اور ایک اپنے سلسلہ کی۔ ''میں'' اور ''تو'' کی کشمکش ہوتی ہے۔ مالی کی توجہ شاملِ حال ہوتی ہے تو اصلی تخمی شاخ کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے اور گملے میں صرف قلمی شاخ کی پتیاں رہ جاتی ہیں۔ اب اس پودے کو کوئی تخمی نہیں کہے گا۔ وہ تو قلمی ہی کہلائے گا۔ چاہے وہ سورن ریکا کا ہو، یا نازک بدن کا۔ اگر مالی کا تصرف اس گملے تک نہیں پہنچا تو دو شاخوں میں سے قلمی شاخ سوکھ سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے اور وہ پودا جیسا تھا ویسا ہی تخمی کا تخمی رہ جاتا ہے۔ ایسا پودا اگر زمین میں جڑ پکڑ بھی لے تو دانت کھٹے کر دینے والا آم، محض گٹھلی اور پوست۔ ریشہ ہی ریشہ، نہ خوشبو نہ رس۔ اور اگر قلمی پیڑ سے کام لینا ہوتا ہے تو مالی تخمی شاخ کو قلم کر دیتا ہے۔ اب ''تو ہی تو'' یا یوں کہیے کہ اللہ ھُو باقی رہ جاتا ہے۔ اب اس گملے کو شفقت کے سائے سے ہٹا کر اور گملے کو توڑ کر مٹی سے مٹی ملا دی جاتی ہے یہ گویا مرید کا قیام ہو گیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ دھوپ کی تیزی اور طوفانی حوادثات اسے جھیلنے پڑتے ہیں اور وہ تو ہی تو۔ اللہ ھُو کی غذا کھاتے ہوئے سورج کی روشنی، مٹی کی طاقت، زندگی کی طاقتوں، اور بارش کے فیضان سے تر و تازگی حاصل کرتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جو مالی دور اندیش ہوتے ہیں دو چار فصلوں کے پھول بھی جھاڑ لیتے ہیں کہ پھل نہ آئیں کیونکہ اس نو عمری کے پھل پھیکے ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ جب یہ درخت کافی سایہ دار ہوتے ہیں اور اس میں فطرت کے غیر معمولی حوادثات کو برداشت کرنے کی طاقت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو اسے دیکھ کر مالی اور باغ کا مالک دونوں خوش ہوتے ہیں کہ یہ میرے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے۔ خوب پھل دیتا ہے، دیکھنے میں حسین، چکھنے میں لذیذ، نہایت لطیف اور خوشبودار۔ اس کے آم ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ہضم کرنا ضرور دشوار ہوتا ہے۔ مگر ہوتے ہیں نہایت صحت بخش اور طاقتور۔ یہ ہے مریدی۔ لیکن پیری کیا چیز ہے یہ بھی کبھی بتلائوں گا۔''

کیا وہ طوفانی رات وہی رات تھی جبکہ ''لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ'' (نہ کوئی اس کا باپ ہے نہ بیٹا) نے گملے کو اپنے آپ سے جدا کر کے اپنے ہی سائے میں رکھ دیا تھا۔ کیا وہ رات وہی رات تھی جب بطنِ مادر سے دنیا کی روشنی میں شور اور ہنگامے کے ساتھ ایک عظیم ہستی آئی تھی۔ کیا وہ رات وہی رات تھی جب ایک قدوسی ہستی کی روح اس چھوٹے سے جسم میں رہتے ہوئے مکان و زمان کی آہنی زنجیروں کو ختم کر چکی تھی۔ کیا وہ رات وہی رات تھی جب بجائے اس کے کہ آسمان کا سورج اس زمین کو زندگی بخشے۔ اس ہستی کے قلب کا سورج آسمان کے سورج کو نور و جلال بخش رہا تھا۔ کون آئینہ ہے اور کون آئینہ دار۔ کون دیکھ رہا ہے اور کس کو دیکھ رہا ہے دیکھنا کس کو کہتے ہیں۔ عشق کیا چیز ہے عاشق کون اور معشوق کون اللہ اللہ۔ فنا کیسی بقا کیسی۔ جب اس کے آشنا ٹھیرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس نے کا نالہ تھا جسے اس کی زمین سے کاٹ کر اس رات جدا کیا گیا تھا تا کہ اس قدوسی زندگی میں قسم رکھے جس کا نالہ و فغاں ہر خوابیدہ دل کو جگا دیتا ہے۔

از نیستاں چوں مرا ببریدہ اند

از نفیریم مرد وزن نالیدہ اند

(جب سے مجھے نیستاں (مرکز) سے کاٹ لائے ہیں۔ اس وقت سے دنیا بھر میری پکار سے نالاں ہے)

مکتی راگ

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

مرن سے پہلے جو مر جائیں　　وہ جگ میں نروان کو پائیں

امر بنیں اور امر بنائیں　　دور رہے ان سے مریتہ

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

گرو ہی گیان ہے، گرو ہی دھیان　　گرو کو دیدے جیون دان

کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَان　　**الاّ اللہُ اللہ ھُو**

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

ذات کا تاج سجائے آیا　　روپ کا چھتر لگائے آیا

پریم کی جوت جگائے آیا　　جیون گائے تو ہی تو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

زلفوں کی واللّیل بنائے　　مکھڑے میں والشمس دکھاتے

نینن سے رحمن سنائے　　صلّ وسَلّم اور صَلّو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

تم ہو طٰہٰ اور یٰسین　　انا فتحنا اور طاسین

تم لولاک کے مہ پروین　　تم ہو ہر کے روبرو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

ثُم وجہ اللّٰہ مرا روپ　　سندر سندر انت انوپ

جیسے اندھیارے میں دھوپ　　پھلواری میں رنگ و بو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

پریم کے بھید بتائے تم نے ہر کے دَرَسن دکھائے دتم نے

بگڑے کاج بنائے تم نے سدھا پرشاست گرو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

رشی منی بھگوان تم ہی ہو گیانی کا سب گیان تم ہی ہو

سارے جگ کا مان تم ہی ہو معنی لاتقنطوا

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

سب سنسار کی تم ہو جان تن من تم سے کلیان

کل یومِ ھو فی شان تمرا انت ہے جیو، ہی جیو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

سچے دھرم کی ریت تم ہی ہو ہر کے من کی ریت تم ہی ہو

ہارے جگ کی جیت تم ہی ہو سارے دکھوں کا دارو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

نس دن روپ نیا دکھلائو ویا کل چت کا دھیر بندھائو

رت رت میں سنگیت سنائو　　من کی شکتی تن کا لہو

مَوتُو قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُو

ولین کی ہے آبرو

(رحمن بابا)

☆...☆...☆